ریاض الرحمٰن شیروانی

الہلال (دور اول) کا معروضی مطالعہ

(بیسوی صدی کی دوسری دہائی میں جن لوگوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور تاج برطانیہ کے طلسم کو توڑنے میں بنیادی کردار ادا کیا' ان میں مولانا ابوالکلام کی بلند پایہ شخصیت بھی ہے۔ مولانا نے اپنے پرچوں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ روایت کی راہ پر چل کر مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ مولانا نے اپنی دعوت کو آگے بڑھانے اور موثر بنانے کے لیے قرآن و حدیث' فلسفہ و کلام اور شعر و ادب کے ذخیرے سے استعاروں' تشبیہوں اور علامتوں کا خوب خوب استعمال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے الہلال نے علمی' ادبی اور سیاسی حلقوں میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کر لیا۔ لیکن جب مولانا کی فکر میں پختگی آئی' تاریخ و فلسفہ کے مطالعہ نے ان کے سامنے زندگی کے حقائق و معارف کے رخ سے پردہ اٹھایا اور ان کا دل قرآن مجید کی تجلیات کا جلوہ گاہ بنا' تو انہوں نے روایت کی رومانوی راہ کو چھوڑ کر جس میں "احیائے ماضی" کا ابہام موجود تھا' خدا پرستی' سچائی اور انسان دوستی کو مذہب کا آفاقی پیغام قرار دیا اور لسانی' نسلی اور مذہبی گروہ بندی اور فرقہ واریت کو سچائی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ترجمان القرآن مولانا کی پختہ فکر اور ادب عالیہ کا حسین شاہکار ہے' لیکن وقت کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ بعض دوستوں نے ترجمان القرآن کو

الہلال کا حریف قرار دیا۔ پروفیسر ریاض الرحمان شیروانی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے "الہلال" کی بنیادی دعوت کو بیان کرنے کے لیے یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ فاضل مقالہ نگار غبار خاطر کے مکتوب الیہ اور مولانا آزاد کے قریبی دوست مرحوم نواب حبیب الرحمان شیروانی کے پوتے ہیں' اور ان کی علمی و اخلاقی وراثت کے امین۔)

(رشید احمد جالندھری)

مولانا ابو الکلام آزاد کی ذات اور کارناموں سے متعلق جو مختلف تنازعات اٹھتے رہے ہیں' ان میں ایک نہایت اہم تنازعہ یہ ہے کہ 1912ء (جب انھوں نے کلکتہ سے ہفتہ روزہ الہلال کا اجراء کیا) میں ان کے افکار کا جو رنگ و آہنگ تھا' کیا 1930ء کے بعد اس میں بنیادی تبدیلی آگئی تھی؟ ایک طرف تو انھیں ان کی زندگی ہی میں اس بنا پر "مرحوم" لکھا جانے لگا تھا کہ انھوں نے' دعوت اسلام سے منھ موڑ کر متحدہ قومیت کو اپنا وظیفہ ء حیات بنا لیا تھا۔ دوسری طرف بیشتر دانش وروں کی رائے ہے کہ شروع سے آخر تک ان کی بنیادی فکر اور پیغام ایک ہی رہے۔ مولانا کے ایک پاکستانی معتقد اور معروف صحافی مولانا غلام رسول مہر کا تو کہنا ہے کہ ان کے موقف کی جزئیات تک میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی (1) خود مولانا آزاد نے 1940ء میں' جب وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے' فرمایا تھا کہ میں جہاں 1912ء میں کھڑا تھا آج بھی ٹھیک وہیں کھڑا ہوں۔ اس مقالے کا مقصد الہلال (دور اول) کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ اس معاملے میں صحیح صورت حال کیا

(سابق پروفیسر' شعبہ عربی' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ)

ہے؟ شروع ہی میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ایسے معاملات میں سو فی صد خالی الذھن ہونا اور پوری طرح معروضی نقطۂ نظر اختیار کرنا' خصوصاً" ایک ایسے شخص کے لیے جس کے مطالعے اور غور و فکر کا موضوع کم و بیش نصف صدی سے مولانا آزاد رہے ہیں' ممکن نہیں ہے۔ (2) تاہم کوشش کی گئی ہے کہ جس حد تک ہو سکے معروضی انداز اختیار کیا جائے۔ دوسری بات' جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا' یہ ہے کہ یہ الہلال کے صرف اس پہلو کا مطالعہ ہے جس کا تعلق مولانا کے بنیادی موقف سے ہے۔ دوسرے سب پہلوؤں سے یہاں صرف نظر کیا گیا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بہت کم عمری سے کر دیا تھا اور جب مختلف مراحل سے گزر کر انھوں نے 1912ء میں الہلال کا اجرا کیا اس وقت ان کی عمر 24 سال سے زیادہ نہیں تھی۔ الہلال کا دور اول 1914ء کے آخر میں ختم ہو گیا یعنی اس کی کل زندگی ڈھائی سال تھی (اس وقت اس کے جانشین البلاغ اور 1927ء کے الہلال پر گفتگو ہمارے پیش نظر نہیں)۔ یہ بات عام طور سے معلوم ہے کہ 1916 میں مولانا آزاد اس بنا پر کلکتہ سے رانچی (بہار) منتقل ہو گئے تھے کہ حکومت برطانیہ نے بنگال میں ان کا قیام ممنوع قرار دے دیا تھا اور ہندوستان کے بیشتر دوسرے صوبوں نے بھی ان کے داخلے پر پابندی عاید کر دی تھی۔ بعد میں انہیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس نظر بندی سے انہیں جنوری 1920ء میں رہائی ملی اور اس وقت وہ دہلی آ کر پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی سے ملے اور انہوں نے کانگریس کی رکنیت اختیار کی۔ 1923ء میں' جب ان کی عمر صرف 35 سال تھی' انہوں نے کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی کی صدارت فرمائی۔ تاہم موجودہ صدی کے تیسرے دہے میں ان کے سیاسی مشاغل تنہا کانگریس تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کے دائرے میں' مجلس خلافت اسلام اور جمعیت علمائے (ہند) بھی شامل رہیں۔ البتہ

1930ء کے بعد، خصوصاً 1935ء کی دستوری اصلاحات کے وقت سے وہ ملک کی مشترکہ سیاسی زندگی سے اس طرح وابستہ ہو گئے تھے کہ ان کے ذکر کے بغیر ملک کی تاریخ مکمل نہیں کی جا سکتی۔ اسی وقت وہ تنازعہ اٹھا جس کا محاکمہ آج کا موضوع ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں بار بار تحریر فرمایا ہے کہ اس کا بنیادی پیغام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے لیکن ان کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ان کے پیغام کا دائرہ بہت وسیع ہے اور حریت طلبی بھی اس میں داخل ہے۔ انہوں نے الہلال کے تیسرے شمارے بابت 27 جولائی 1912ء میں اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ:

> "اسلام دنیا کی ہر اس حکومت کو جو دستوری اور پارلیمنٹری نہ ہو، سب سے بڑا انسانی گناہ اور سخت سے سخت معصیت قرار دیتا ہے۔"

ہماری رائے میں الہلال کے آغاز ہی میں حکومت کے لیے دستوری اور پارلیمنٹری کی شرط عاید کر کے مولانا نے مذہبی یا اسلامی نظام حکومت کے مروجہ تصور کی نفی کر دی۔ ظاہر ہے کہ دستور عوامی نمائندے بنائیں گے اور پارلیمنٹ میں فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ آگے چل کر انہوں نے تحریر فرمایا:

> "پس ہندوستان کے مسلمانوں کا بہ حیثیت پیروان قرآن ہونے کے (ہم) فرض سمجھتے ہیں کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے پارلیمنٹ کا مطالبہ کریں اور جب تک مل نہ جائے اپنے مذہب کی خاطر دم نہ لیں۔"

پروفیسر رشید الدین خاں کی رائے ہے کہ مولانا آزاد کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے متحدہ قومیت کے لیے شرعی اور مذہبی اساس

مہیا کی۔ (3) میرے نزدیک مندرجہ بالا عبارت اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ بلاشبہ مولانا کے اولین مخاطب مسلمانان ہند تھے، جن کو انہوں نے مذہب کی راہ سے تحریک آزادی میں شرکت کی دعوت دی لیکن شروع ہی سے ان کے ذہن میں اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ آزاد ہندوستان میں جو بھی حکومت قائم ہو گی وہ دستوری اور پارلیمنٹری ہو گی۔ اسی زمانے میں نواب حامد علی خان والی رام پور کا پویونیر میں ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ:

"ابھی ملک حکومت خود اختیاری کے لیے تیار نہیں ہے"

مولانا نے اس پر سخت تعریض کی۔

الہلال کے چوتھے شمارے بابت 14 اگست 1912ء میں مولانا نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اس لیے خیر مقدم کیا کہ مسلمان سمجھ جائیں کہ حکومت سے اپنی بات منوانے کے لیے صراط مستقیم خوشامد نہیں بلکہ جدوجہد ہے۔ اسی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مسئلہ الحاق کو بھی جوڑ دیا۔ مسلم یونیورسٹی سے مولانا کو شروع ہی سے دلچسپی رہی لیکن وہ اسے ایک ایسی یونیورسٹی دیکھنا چاہتے تھے جس کی حیثیت صحیح معنی میں کل ہند ہو اور اسے مسلم کالجوں کے الحاق کا حق حاصل ہو، نیز وہ اپنے معاملات میں آزاد ہو۔ مسلمانوں کا ایک دوسرا تعلیمی ادارہ، جو آگے چل کر الہلال کے مباحث کا موضوع بنا، ندوۃ العلماء، لکھنؤ تھا۔ اس کے بارے میں مولانا آزاد کی دلی خواہش تھی کہ وہ جن مقاصد کی خاطر قائم کیا گیا ہے ان پر پوری طرح مستحکم رہے۔

مولانا آزاد کے نزدیک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بنیادی مقصد عدل حقیقی کا قیام ہے، جو افراط و تفریط سے مبرا ہو۔ من شاء فالیومن و من شاء فالیکفر کی تفسیر انہوں نے یہ کی ہے کہ کفر و اسلام، شرک و توحید، نور و ظلمت، صداقت و کذب، حق و باطل دو راستے ہیں اور ان میں سے کسی ایک

راستے کا انتخاب ہر ایک کو کرنا ہے۔ اس معاملے میں وہ تیشے کے استعمال کے بھی خلاف نہیں تھے۔ کیوں کہ سمجھتے تھے کہ اس کے استعمال کے بغیر کسی پرانی عمارت کی بنیاد اکھاڑنا ممکن نہیں۔

الہلال شمارہ نمبر 7 بابت 25 اگست 1912ء میں انہوں نے ملکی مسائل میں ہندوؤں کی کامرانیوں اور مسلمانوں کی ناکامیوں کا سبب ہندوؤں کی جدوجہد اور مسلمانوں کی مراعات طلبی کو قرار دیا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس کی مثال تنسیخ تقسیم بنگال سے دی ہے۔ اسی وقت سے ان کی مستحکم رائے تھی کہ ملک کی اصلی کارکن جماعت کانگریس ہے۔ ساتھ ہی ان کا مسلک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کا "کوئی وطن، کوئی مقام، کوئی محدود چار دیواری کی روایت، کوئی مخصوص حلقہ تربیت نہیں ہے۔ ساری دنیا ہمارا گھر ہے اور خدا کے تمام بندے ہمارا کنبہ ہیں۔" یہ بین الاقوامیت کا وہ وسیع تصور ہے، جہاں تک دوسرے اہل فکر بہت بعد میں پہنچے۔ مولانا آزاد کا یہ مسلک مدت العمر رہا۔ وزیر تعلیم حکومت ہند کی حیثیت سے انہوں نے اپنی اس تقریر میں جو "یونسکو اور بین الاقوامی مفاہمت" کے موضوع پر نئی دہلی میں 1951ء میں فرمائی تھی، کہا تھا کہ جغرافیہ اس طرح نہیں پڑھانا چاہیے کہ پہلے ہم ایک شہر، پھر ایک صوبے، پھر ایک ملک، پھر ایک براعظم اور پھر دنیا کے باشندے ہیں بلکہ اس طرح پڑھانا ہے کہ پہلے ہم دنیا کے باشندے ہیں اور پھر براعظم، ملک، صوبے اور شہر کی طرف مراجعت کرنی چاہئے۔ (4) مولانا کے نزدیک امت واحدہ کا تصور صرف مسلمانوں اور ہندوؤں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے دائرے میں تمام اقوام عالم شامل تھیں۔ ان کا ارشاد تھا کہ:

"اسلام دنیا میں کسی وطن و مقام اور قوم و مرزبوم کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔" اور یہ نتیجہ انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے اخذ کیا تھا:

"ان هذه امتكم امة واحدة وانا ربكم فاعبدون۔"

وہ اسلام کی روایات کے پیرو تھے اور کہتے تھے کہ قرآن کی زبان میں ان روایات کا نام صبغته اللّٰہ ہے۔ وہ اسلام کو یک سر عمل مانتے تھے اور "اخلاق میں .... اصل عمل محبت" بتاتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا:

"جس قدر محبت کی راہ میں محبت کا جوش رکھتے ہو' محبت ہی کی خاطر بغض کی راہ میں بغض کا جوش ظاہر کرو۔"

ان کا قول تھا کہ:

"محبت کی خاطر عداوت اور امن کی خاطر بدامنی قانون کو بھی کرنی پڑتی ہے۔"

وہ ارض الٰہی کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لیے تلوار سے مدد لینے کے اس بنا پر قائل تھے کہ اس کی اجازت قرآن نے دی ہے اور حصول آزادی کی خاطر گاندھی جی سے اشتراک عمل کے بعد بھی انہوں نے عدم تشدد کو بطور فلسفہ حیات قبول نہیں کیا تھا بلکہ بطور پالیسی کے اختیار کیا تھا۔ اس کی وضاحت انہوں نے اپنی آخر عمر کی تالیف "انڈیاونس فریڈم" میں اس مقام پر فرما دی ہے جہاں دوسری جنگ عالم کے دوران حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون یا عدم تعاون پر گاندھی جی اور ان کے کٹر پیروؤں سے اپنے اختلاف رائے کی تفصیل بیان ہے۔ (5) ان کا خیال تھا کہ:

"امر بالمعروف کا فرض بغیر کامل ایمان باللہ کے ادا نہیں ہو سکتا۔" اور کامل ایمان باللہ" کی تشریح وہ اس طرح کرتے تھے:

"ہر وہ شے جس کے لینے کا حق صرف خدا ہی کو ہے۔ اگر اس کے سوا کسی دوسرے ہستی کو دی جائے تو یہ بھی شرک ہے---- انسان _____ خود اپنے تئیں خدا

کے سوا اور کسی کو نہ دے ____ سب کو خدا کے لیے
اختیار کرے اور سب کو خدا کے لیے چھوڑ دے۔"

اس سب میں وہ حریت کو بھی شامل کرتے تھے اور اسی لیے مسلمانوں کو حریت طلبی کی طرف بلاتے تھے۔ ہندوستان میں اکثریت و اقلیت کے مسئلے اور ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ان کا جو موقف 1923ء سے 1947ء بلکہ 1958ء تک رہا۔ 1912ء میں بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ انہوں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ:

"مسلمان تعداد کی قلت و کثرت کے چکر میں پڑ گئے ہیں ... اسلام کی نظر میں تعداد کوئی چیز نہیں ... کانگریس میں اس لیے جا نہیں سکتے کہ تعداد کم ہے' ہندو مار ڈالیں گے' سلف گورنمنٹ کی خواہش میں اس لیے شریک نہیں ہو سکتے کہ تعداد کم ہے' ہندو گورنمنٹ بن جائے گی ... خدا سے ڈرنا چاہیے ... تم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو ہم سایوں سے معانقہ کر لو اور زندہ رہنا ہے تو ان سے الگ رہنے کا تجربہ بہت دن کر چکے' اب ان سے مل جاؤ۔ اگر ان کی طرف سے رکاوٹ ہے تو اس کی پرواہ مت کرو۔"

پھر لکھا:

"مسلمانوں کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اپنے تمام کاموں کے لیے گورنمنٹ پر اعتماد رکھنے کا راستہ اختیار کیا۔"

بیرونی حکومت ملک کے کسی ایک عنصر کو اپنے دام فریب میں گرفتار کر کے اس سے یہ کام لینا چاہتی تھی کہ:

"ملکی فوائد کو اس ... کے فوائد پر قربان کر دے۔"

1857ء کی بغاوت کی پسپائی کے بعد حکومت نے یہ کام ہندوؤں سے لیا

لیکن جب مولانا آزاد نے الہلال کا اجراء کیا' اس وقت حکومت اپنے مفاد کے لیے مسلمانوں کو استعمال کر رہی تھی۔ مولانا کو ملال تھا کہ مسلمان اس کا آلہ کار بن گئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خلیج پیدا ہو گئی۔ جب حکومت وقت نے "رفارم اسکیم" پیش کی اس وقت بھی مسلمان ہندوؤں سے الگ ہی رہے:۔

"پولٹیکل کاموں کا اسٹیج ملک بھر میں صرف ایک کانگریس ہی کا تھا۔ پس ضرور ہوا کہ اب تبدیل ذائقہ کے لیے کوئی نیا کھلونا ہماری گود میں ڈال دیا جائے۔ جو زمانے کے تغیرات کا لحاظ کر کے پالیٹکس کے نام سے شکل پذیر ہوا۔"

لیکن مولانا خوش تھے کہ بہرصورت:

"پالیٹکس کی حرمت کا فتویٰ منسوخ ہو چکا تھا اور کم از کم جمود میں ایک حرکت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔"

تاہم انہیں یہ تشویش بھی تھی کہ مسلمانوں کو بتایا گیا تھا کہ:

"تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے اپنے حقوق ہندوؤں کے مقابلے میں" حاصل کر لو۔"

چنانچہ یہ نتیجہ نکلا کہ:

> "حقوق طلبی کی جس طاقت کا نشانہ گورنمنٹ ہوتی' نہایت آسانی کے ساتھ اس کا رخ ہم سایوں کی طرف پھیر دیا گیا اور اس طرح ایک پوری قوم میں آ جانے کے بعد بھی اس کی پولیٹیکل بیداری سے گورنمنٹ کے لیے کوئی خدشہ باقی نہ رہا۔"

اگرچہ مولانا آزاد ملک میں پولیٹیکل کاموں کا سٹیج کانگریس کو مانتے تھے' تاہم مسلمانوں کو کسی کا مقلد اور پیرو بن کر رہنے کی تلقین نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس ان کی رائے تھی کہ:

"ہم اسلام کو اس سے بہت بلند سمجھتے ہیں کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی کسی دوسری قوم کی تقلید پر مجبور ہوں۔ وہ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے والے ہیں' نہ کہ خود دوسروں کے مقلد بننے والے۔ پس ہماری تعلیم وہی ہے جو اسلام کی ہے ... وہ اپنے پیروؤں کو جائز آزادی حاصل کرنے کے لیے ہر وقت حرکت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایک جمہوریت اور مساوات کی روح ہے اور اس حکومت کو خدا کی مرضی کے مطابق نہیں سمجھتا' جو پارلیمنٹری اور دستوری نہیں ہے۔ یہ مقصد مسلمانان ہند کو ہندوؤں سے نہیں بلکہ قرآن سے سیکھ کر اپنا نصب العین بنانا چاہیے۔"

اس کا مطلب واضح ہے' مولانا آزاد مسلمانوں کو اس راہ پر چلنے کا مشورہ اس لیے نہیں دے رہے تھے کہ یہ کانگریس کا نصب العین تھا بلکہ اس لیے دے رہے تھے کہ' ان کے خیال کے مطابق' قرآن کا فرمانا تھا۔ ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے قائل اور حامی بالکل نہیں تھے بلکہ کار زار حیات میں قائدانہ رول ادا کرنے کے خواہش مند اور مبلغ تھے۔ آٹھویں شمارے میں ایک گم نام بزرگ کا مراسلہ شائع ہوا جس میں انہوں نے اعتراض کیا کہ:

"آپ اپنے مذہبی رنگ میں پالیٹکس کو بھی خلط ملط کر دیتے ہیں۔"

اور پھر سوال کیا کہ:

"آپ قوم کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔" (اب تک کا راستہ یا اعتدال پسند ہندوؤں کا راستہ یا ہندی انارکسٹوں کا راستہ)۔ مولانا نے جواب دیا:

"انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو' ہم تو اسے مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

"پالیٹکس کی ایک چوتھی راہ .... راہ الٰہی ہے۔ یہ راہ "صراط مستقیم" امتہ وسطا' صلح و امن' نیکی کی حفاظت اور فساد کا رد۔ (اس کے تحت لکھا: "ہر اچھی بات کرنے والوں کے ... مددگار ہوں")۔ استیلا و اقتدار کی مخالفت۔ اس آخری شق کی وضاحت کی۔

> "(قرآن) کے نزدیک وہی حکومت جائز ہو سکتی ہے جو شخصی نہ ہو بلکہ کسی ملت اور قوم کے ہاتھ میں ہو۔ (مسلمان) جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت جب تک انہیں نہ مل جائے اپنے اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں۔"

آگے چل کر لکھا:

> "ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملکی (ترقی) اور آزادی کے لیے سعی کریں گے ... اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے' دونوں کی تعلیم دی ہے .... قوموں اور ملکوں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔"

الہلال شمارہ نمبر 12 بابت 2 ستمبر 1912ء میں "اتباع و اعتماد" اور "اتحاد" کا فرق اس طرح واضح کیا:

> "(مسلمانوں نے) ہمیشہ سیاسی آزادی کو ہندوؤں کا مترادف سمجھا مگر خود اپنے تئیں بھولے رہے ... شائد آپ کی رائے ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد بھی مسلمانوں کے لیے مضر ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے متفق نہیں

ہو سکتے۔"

اس کے بعد کے شمارے میں اسی موضوع کو یوں آگے بڑھایا:

"اسلام کے دامن تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما دھبہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر۔"

مولانا آزاد نے یہی بات بعنوان دیگر اپنے 1940ء کے خطبہ صدارت رام گڑھ میں کہی اور پھر یہی بات ایک دوسرے انداز سے 1947ء میں جامع مسجد دہلی کی تقریر میں دہرائی۔ مولانا کے ذہن میں حکومت الہیہ کا تصور کیا تھا؟ اس کی تشریح مندرجہ ذیل عبارت سے ہو جاتی ہے:

"احکام اسلام کی بندش ایک ایسے قانون کی بندش (ہے) جس کی سلطنت تمام قوانین مادیہ کے نظام حکومت سے بالاتر اور وراء الورئی ہے اور نظم کائنات کے تمام اجزاء اسی بندش سے بندھ کر مرتب اور منظم ہوتے ہیں ... اسلام .... ان قوائے نظریہ کے صحیح استعمال کا نام ہے جن کی حکومت سے دنیا کی کوئی شے خارج نہیں۔"

مولانا مسلمانوں میں حصول آزادی کی تبلیغ کرتے تھے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی اصلاح و ترقی کے لیے ان کے اندر مذہبی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں:

"باوجود اس کے کہ ہم روز اول سے مسلمانان ہند کی ایک بڑی بدبختی یہ قرار دے رہے ہیں کہ ان کے لیڈروں نے غلامی و خوشامد کی داروئے بے ہوشی سے قوم کی قوم کو مرض النوم میں مبتلا کر دیا ہے' ہم مسلمانوں کو

کبھی یہ صلاح نہیں دیں گے کہ وہ صرف پولیٹیکل آزادی
کے ولولے ہی کو پیدا کر کے اصلاح و تغیر کی طرف سے
فارغ البال ہو جائیں۔ کیوں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں
کے لیے پولیٹیکل پالیسی کے تغیر میں کوئی برکت نہیں ہو سکتی
اگر ان کے اندر مذہبی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔"

مولانا صرف غیر ملکی حکومت ہی کے مقابلے میں غلامی و خوشامد کو ناپسند نہیں کرتے تھے بلکہ حصول آزادی کے بعد 1947ء کے خوں آشام دور میں ملکی حکومت کی طرف بھی جس کے وہ خود ایک رکن رکین تھے' ان کا رویہ یہی تھا۔ ان کی جامع مسجد دہلی کی جس تقریر کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا اس میں انہوں نے کہا تھا:

"میں تم سے نہیں کہتا کہ حکومت کے مدرسے
سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور خوشامد اور کاسہ
لیسی کی وہی پالیسی اختیار کرو جو غیر ملکی حکومت کے دور میں
تمہارا شعار تھا۔"

مولانا آزاد کے نزدیک پالیٹکس میں مذہب کی راہ "راہ یقین" ہے۔ انہوں نے بتایا کہ:

"پولیٹیکل زندگی کے سفر میں ہر اس محکوم قوم کو"
جو سیاسی زندگی حاصل کرنا چاہے گی" کن راہوں سے گذرنا
ہوتا ہے۔ "ایک نہایت خطرناک منزل پولیٹکل مطالبات کا
اصولی اختلاف و نزاع" ہے۔ پہلا مضر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ
ملکی آزادی کے حملے سے بچنے کے لیے یہ نزاع حکومت کے
ہاتھ میں ایک مضبوط ڈھال بن جاتا ہے اور حملہ آوروں کا
باہمی نفاق حریف کو فرصت دے دیتا ہے کہ جنگ کے نتیجے

سے محفوظ ہو جائے۔"

لیکن وہ مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ:

"اگر وہ اپنی پولیٹیکل زندگی کو مذہب سے وابستہ کر دیں اور جس راہ کو اختیار کریں اسے اپنا ایک مذہبی حکم سمجھ کر اختیار کریں تو اسلام کے خوارق سے بعید نہیں کہ وہ ان کو ان موانع سے بالکل محفوظ کر دے۔"

مولانا آزاد نے پارلیمنٹری نظام حکومت کا نہ صرف جواز بلکہ وجوب' اسلام کے اصول شوریٰ سے اخذ کیا تھا اور اس کے دائرے میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی شامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ذمیوں سے مشورہ کرنے کو نیز یہودیوں اور عیسائیوں سے کام لینے کو اسلام جائز رکھتا ہے اور ماوردی کے حوالے سے لکھا کہ:

"چاہے وہ عہدہ وزارت ہی کیوں نہ ہو۔"

انہوں نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ:

"اصول شریعت اسلامیہ میں بھی کوئی ایسا قاعدہ نہیں ہے جو مجلس نیابی (پارلیمنٹ) کے خلاف ہو۔" اور پھر ابن العربی کا یہ قول نقل کیا کہ:

"قواعد شریعت کی رو سے باہم مشورہ کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ اسلام کا اصول حکومت اور اصلی نظام خلافت ہے۔"

انہیں اس کا ملال تھا کہ:

"متاخرین سلاطین اسلام نے ملکی معاملات میں استبداد سے کام لیا اور حکومت و اختیارات اپنے لیے مخصوص کر لیے۔"

الہلال شمارہ نمبر 23 بابت 18 دسمبر 1912ء میں "الجہاد الجہاد" کے زیر

عنوان مولانا کا وہ مضمون شائع ہوا ہے جو ان کے خطیبانہ رنگ تحریر کا بہترین نمونہ ہے- اس میں انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کو قائدانہ رول ادا کرنے کے لیے اس طرح ابھارا ہے:

"پس چاہیے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس (ملت اسلامیہ) کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں کیوں کہ اس کے پاس اسلام تھا اور اسلام آگے رہنے کے لیے ہے' پیچھے رہنے کے لیے نہیں ... وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں- پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ... تم ... نڈر ہو' بے خوف ہو' جری ہو' آزاد ہو' خود مختار ہو- نہ صرف اتنا کہ خود آزاد ہو بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بند استعباد سے نجات دلانے والے ہو .... بے شک مسلمانوں کو اپنے حقوق قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہئے کہ درخت اپنی جگہ پر محفوظ ہو-"

حصول آزادی کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد مولانا آزاد کا نصب العین رہا' جس کے لیے وہ دم واپسیں تک کام کرتے رہے اور جو چیز اس میں حائل ہوئی اس کے ازالے کے لیے زبان و قلم کے استعمال سے انہوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی- اس ضمن میں انہوں نے 1912ء میں لکھا:-

"ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازی گروں کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں- فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے ... سات کروڑ

انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے جب کہ تم اس
قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہو۔"

یہ موضوعات یعنی ملک کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد الہلال کے مختلف شماروں میں بار بار زیر بحث آئے ہیں اور مولانا نے ان سے متعلق ان ہی خیالات و جذبات کا اظہار بار بار مختلف انداز میں کیا ہے۔ چوں کہ مولانا آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنے مذہبی مشن یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا لازمی جز سمجھتے تھے اس لیے ان کی تحریروں میں ان باتوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ 1913ء کے پہلے شمارے بابت 8 جنوری میں انہوں نے "الہلال" کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا:

"الہلال کی دعوت کے تمام اغراض و مقاصد اور اصول و فروع کا نقطہ وحید صرف اس دین الٰہی کی دعوت کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول: الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کو زندہ کرنا (ہے) ... ہر اطاعت کے لیے ایک سرکشی، ہر وفاداری کے لیے ایک دشمنی اور ہر عاجزی کے لیے ایک غرور و تمرد لازمی ہے ... وہ حکومت الٰہی کے مقابلے میں اپنا تخت تسلط بچھانے والی قوت شیطانی جو انسانوں کو خدا سے چھین کر اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتی ہے ... مدعیان اطاعت الٰہی کے لیے دنیا میں اصلی اور پہلی آزمائش ہے۔ کوئی ہستی خدا کی مطیع ہو نہیں سکتی جب تک اس قوت اور اس قوت کے تمام مظاہر سے باغی و متمرد نہ ہو جائے ... جو اللہ کا مطیع ہو ضرور ہے کہ شیطان سے باغی ہو۔"

مولانا "حق کے قیام اور گمراہی کے انسداد" کا امت اسلامیہ کو ذمہ دار قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ:

"اسلام نے ... امر بالمعروف کو ہر فرد امت کا فرض قرار دے کر اس کی ذمہ داری پوری قوم پر پھیلا دی۔"

اگلے شمارے میں مولانا نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں داعیان حق و صداقت کی کثرت و قلت سے بحث کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت کا وجود رہا جس کے قدم حق و حقیقت پر غیر متزلزل ہوتے تھے"

شمارہ نمبر8 بابت 26 فروری 1913ء میں مولانا رقم طراز ہیں:

"اسلام دنیا میں صرف اس لیے آیا کہ وہ انسانوں سے ان تمام اقتداروں کو چھین لے جن کے ذریعے وہ تحکم اور جبر کے ساتھ غیر مسئولانہ حکومت کرتے ہوں ... اس کے نزدیک غیر مسئول ہونا اللہ کی صفت ہے ... وہ اس طرح کے اقتدار کو صرف اللہ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے (ان الحکم الا اللہ) اور اسی کو دین قیم قرار دیتا ہے (ذالک الدین القیم) پھر اگر اس اقتدار کا حق دنیوی امور میں کسی کو ہے تو وہ صرف "قوت شوریٰ" یا جماعت کا اجماع و مشورہ ہے اور وہ بھی اپنے تمام اعمال میں احکام الہیہ کے تابع رہنے پر مجبوراً ہے۔"

گویا مولانا کسی ایسے اقتدار کے حق میں ہرگز نہیں تھے جو شخصی ہو اور کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو' چاہے وہ ملوکیت ہو یا آمریت۔ وہ اقتدار اعلیٰ کو شوریٰ اور اجماع' کا پابند رکھنے کے قائل تھے اور اگر وہ بھی احکام الٰہی سے متصادم ہو تو بالادستی احکام الٰہی ہی کو حاصل رہے گی۔

مولانا کثرت و قلت کے طلسم خیالی سے ہمیشہ بے زار رہے۔ وہ حق و

صداقت کو خود اپنا معیار مانتے تھے' نہ کہ کثرت رائے کا پابند۔ انہوں نے الہلال کے شمارہ نمبر10' بابت مارچ 1913ء میں اس بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کیا:

"صداقت اپنے حامیوں کی کثرت و قلت سے اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ بے پرواہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ تمہارے پاس اس لیے نہیں آتی کہ تمہاری محتاج ہو۔ سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں کی کثرت نہیں' اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سچ ہے۔"

ساتھ ہی وہ عاقبت کار حق کی فتح مندی پر بھی غیر متزلزل اعتقاد رکھتے تھے۔ انہوں نے الہلال کے شمارہ نمبر13' بابت 2 اپریل 1913ء میں اپنے اس عقیدے کا اظہار بایں طور کیا:

"میرا ایک ایسا اعتقاد محکم اور ایقان قلبی ہے جس کی صدا ہر آن و ہر لحہ میرے اندر سے اٹھتی رہتی ہے ... وہ حق کی فتح مندی اور ہر مظہر باطل کی شکست کا قانون الٰہی ہے ... قرآن کریم میں "العاقبتہ للمتقین" ہر جگہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اغراض فاسدہ اور مقاصد ردیہ گو بظاہر حق و صداقت کے مقابلے میں کام یاب ہو جاتے ہیں' ان کی کامیابی محض ہنگامی و عارضی ہوتی ہے اور انجام کار کی فتح و فیروز مندی ان کے حصے مین نہیں آ سکتی۔ یہ آخری کامیابی ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی تائید غیبی کے اعلان کے لیے ایک نشانی قرار دیا ہے۔"

اسی مقصد کے حصول کے لیے مولانا آزاد نے الہلال کے شمارہ نمبر16 بابت 23 مارچ 1913ء میں "العجل العجل' الساعۃ الساعۃ" اور "من انصاری

الی اللہ" کے زیر عنوان مسلمانان ہند کو نصرت حق کی دعوت دی اور حزب اللہ کے قیام کا اعلان کیا۔ پروفیسر مشیر الحق مرحوم نے ماہنامہ "ایوان اردو نئی دہلی" (دسمبر 1988ء) میں اس تنظیم کی تشکیل کی غرض و غایت سے بہت اچھی بحث کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولانا آزاد کی ایسی جملہ تحریکوں میں مساعی کا مقصد اصلی مسلمانان ہند کو غیر ملکی استبداد کے مقابلے میں صف آرائی کے لیے تیار کرنا تھا۔

الہلال کے شمارہ نمبر 23 بابت 11 جون 1913ء اور نئی جلد کے شمارہ نمبر 2، بابت جولائی 1913ء میں مولانا آزاد نے ایک ایسے موضوع سے بحث فرمائی ہے جس کی معنویت آج 50، 60 سال کے بعد کے حالات و حوادث نے آشکار کر دی ہے۔ جس وقت مولانا اس موضوع پر قلم فرسائی فرما رہے تھے، ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور آج جب ان کے اقوال کی معنویت آشکار ہوئی ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور یہاں مولانا کے خوابوں کا "دستوری اور پارلیمنٹری" نظام حکومت قائم ہے۔ انہوں نے 11 جون کے شمارے میں "مسجد، مچھلی بازار، کان پور" کے زیر عنوان لکھا تھا:

> "مسجدوں کی جب کبھی بحث چھڑتی ہے تو صرف چند عمارتوں کا سوال نہیں ہوتا بلکہ "قومی عزت و ذلت اور دینی تذلیل و تعظیم" کی ایک نظیر اگر آج قائم ہوتی ہے تو کل کے لیے اس کے دامن میں ہزاروں واقعات پنہاں ہوتے ہیں۔ اس وقت مسجد کے وضو خانے کا سوال ہے، کس کو معلوم ہے کل محراب و منبر کا نہ ہو گا۔ اگر مسجدیں ڈھا کر سڑکیں نکالی جا سکتی ہیں تو پھر اقلیم ہند کے کسی شہر میں کسی مسجد کی زندگی بھی خطرے سے خالی نہیں۔"

یہ عبارت بابری مسجد، اجودھیا کے انہدام کے تناظر میں قابل غور تو

ہے ہی' ساتھ ہی ان حضرات کے لیے تازیانہ عبرت بھی ہے جو مسلمانوں کو اس حادثہ فاجعہ کو فراموش کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں- 9 جولائی کے شمارے میں اسی مسئلے پر وہ رقم طراز ہیں:

"کیا یہ سچ ہے کہ اب ہندوستان میں ہمارے دارالامان اور شعائر اسلامیہ اور عمارات دینیہ کا انہدام علانیہ شروع ہو گیا؟ اب کرچیں چڑھائی جائیں گی تا کہ پرستاران الٰہی کو اپنی مساجد کے احترام سے روکیں؟ کیا شہروں کی ناکہ بندی کی جائے گی تا کہ مسجدوں کے حصے گرائے جائیں اور ان دیواروں کو جن کے اندر پانچ مرتبہ خدائے واحد کے نام کی منادی ہوتی تھی جبرو قہر اور آلات و اسلحہ کے زور سے غبار بنا کر اڑا دیا جائے- پھر کیا اسلام کی مسجدیں بے یار و مددگار ہو گئیں اور کیا آج خدا کی زمین پر کوئی نہیں کہ اس کی پرستش گاہوں کی عظمت کو برقرار رکھ سکے-"

مولانا آزاد کی 11 جون اور 9 جولائی 1913ء کی تحریروں کو ملا کر پڑھا جائے تو 6 دسمبر 1992ء کے انہدام بابری مسجد کے تناظر میں ان کی عبقریت اور دوربینی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے- پاکستان کے ایک انصاف پسند مصنف پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنے ایک مضمون "ایک صاحب نظر پر نظر ثانی" جو ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی کے اکتوبر 1990ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا' کا آغاز اس طرح کیا تھا:

"انگریزی کے مشہور افسانہ نگار' ناول نگار اور ڈرامہ نگار سمرٹ مائم نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ میرے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ میں اپنے سامنے کی

اس دیوار کے اس پار دیکھ سکوں' لیکن مولانا آزاد جیسی شخصیتوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض انسان اپنے سامنے کی اس دیوار کے اس پار بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

مندرجہ بالا دونوں تحریروں کی روشنی میں پروفیسر نظیر صدیقی کے مولانا آزاد سے متعلق اس دعوے کی کیسی بھرپور لیکن افسوس ناک تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس تصدیق کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس المیے کا آغاز مولانا کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اگرچہ اس کا انجام ان کی وفات کے تقریباً 25 سال کے بعد دسمبر 1992ء میں ہوا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ مولانا آزاد کی نگاہ دوربیں جب یہ کچھ دیکھ رہی تھی تو انہوں نے اس کا حل کیا تجویز کیا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے اس کا حل تجویز فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ مسلمانان ہند نے اسے قبول نہیں کیا۔ بہر حال ان کا یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے۔

"کیا آج خدا کی زمین پر کوئی نہیں کہ ان کی پرستش گاہوں کی عظمت کو برقرار رکھ سکے؟"

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مولانا انسانی غلامی کو منشائے الٰہی کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے الہلال کی تیسری ششماہی کے پہلے شمارے بابت 2 جولائی 1913ء میں الحریۃ فی الاسلام' کے زیر عنوان لکھا:

"ان (مسلمانوں) کا پیغمبر دنیا میں صرف اس لیے آیا تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائے ... اسلام خود اپنے بیان کے مطابق ... دین و دنیا کی اصلاح کے لیے آیا تھا... پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام کے خزانہ ہدایت میں حسنات سیاست دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نصف خدمت انسانی کی انجام دہی سے وہ

مقصر رہا جس کا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کر سکتا ... اس نے باقاعدہ ایک قانونی و جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی ... شخصی و ذاتی امتیاز کو یکم قلم مٹا دیا۔" "وشاورھم فی الامر (153:3) اور "وامرھم شوریٰ بینھم" (36:46) کے بموجب "حکومت اسلامیہ میں مشورہ شرط ہے .... حکومت اسلامیہ کسی کی ذاتی ملک نہیں بلکہ جمہور اسلام کی ملک ہے ... دراصل یہ اسلام کی واضح ترین خصوصیت ہے کہ اس کی نظر میں آقا اور غلام، معزز اور حقیر، چھوٹا اور بڑا، امیر اور فقیر سب برابر ہیں .... قانون اسلام کی نگاہ میں حاکم و محکوم اور امام و عامتہ الناس یکساں ہیں۔"

مولانا نے بجا طور پر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ:

"اسلام کے سامنے صرف ایک ہی چیز ہے جس سے انسانوں کے باہمی رتبے میں تفریق ہو سکتی ہے یعنی تقویٰ اور حسن عمل۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقکم (14:49)

مولانا نے اسوۂ ابراہیمی کی روشنی میں دعوت الی الحق کی جو اسکیم پیش کی اس میں دس نکات شامل تھے۔ یہاں ان سب کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ البتہ تین ابتدائی نکات ایسے ہیں جن کے اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے:

1۔ "ہر اس شخص کا جس میں ایک ذرہ بھی ایمان اور اسلام ہو، یہ ایک مقدس فرض ہے کہ مظالم و مفاسد (مشمول ظلم عظیم شرک) کے استیصال کے لیے آمادہ ہو جائے۔"

2۔ "جو لوگ ارباب اقتدار ہوں، پھر... خدا کو بھول جائیں، مستبد بن بیٹھیں ... تو ایسی قوم کو اس کی غلط کاریوں سے علانیہ آگاہ کر دینا چاہئے، علم حق و معروف لے کر مفاسد و منکرات کے خلاف آمادہ جہاد

ہو جانا چاہئے۔"

3۔ مسلم کی مشہور حدیث "من رای منکرا فلیغیرہ بیدہ' فان لم یستطع فبلسانہ' فان لم یستطع فبقلبہ و ذاک اضعف الایمان۔" نقل کر کے مولانا نے ایک بصیرت افروز نکتہ یہ بیان فرمایا ہے: ازالہ منکرات کے لیے دل میں کڑھنے اور زبان سے نالہ و فریاد کرنے کی صورتیں اسی وقت تک کے لیے ہیں جب تک ان سے کشود کار ممکن ہے' جہاں یہ باتیں بے سود ہیں' وہاں ایمان کا صرف ایک مظہر ہے اور وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو استعمال طاقت کے قابل بنالیں اور پھر اس طاقت سے منکرات اور مفاسد و مظالم کو مٹائیں۔"

اسی موضوع پر اگلے شمارے میں اس عبارت کا اضافہ کیا ہے:

"عاجزی کے آنسوؤں اور فریاد کی صداؤں سے کبھی کسی فوج نے میدان سر نہیں کیا۔ اصلی چیز اجماعی قوت ہے اور ہزاروں دلوں اور زبانوں کا کسی کام کے لیے ایک ہو کر ظاہر ہونا ہی کلید فتح ہے۔"

شمارہ نمبر 15 بابت 8 اکتوبر 1914 میں "الحریۃ فی الاسلام" کے تحت جمہوریت کے بنیادی اصول: (1) منع حکم ذاتی 2- مساوات عمومی 3- انتخاب رئیس اور 4- اصول شوریٰ قرار دیے اور ان سب کا اصل الاصول یہ بتایا کہ السلطنہ للشعب وحدہ۔ اس بارے میں احکام اسلامیہ بایں طور بیان کیے:

1- اسلام ہر قسم کے ذاتی و شخصی تسلط کی نفی مطلق کرتا ہے۔ "حکومت جمہور کی ملک ہے' ذات اور خاندان کو اس میں دخل نہیں"۔ گویا ملوکیت اور آمریت دونوں اس کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہیں۔

2- مساوات عمومی فرد بشر یعنی خاندانی' ملکی' قومی اور مالی امتیازات کوئی شے نہیں ہے۔

3- رئیس جمہوریہ کو اسلام خلیفہ کہتا ہے اور "اجماع" سے مقصود قوت اکثریت انتخاب ہے۔

4- اسلام کا خلیفہ اس شان میں سامنے آیا کہ پھٹی ہوئی چادر اور دو وقت کی غذا کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔

بعد ازاں کہتے ہیں:

1- اسلام نے اپنے نظام حکومت سے بہ کلی بادشاہ کو خارج کر دیا اور ایک کامل جمہوریت قائم کی۔

2- مساوات کا اعلیٰ ترین تصور (یہ ہے) کہ سوائے تقوی کے وجہ امتیاز کچھ نہیں۔ نہ رنگ و نسل اور نہ ملک و قوم۔ "اسلام صرف وطن ہی کی محبت لے کر نہیں آیا' اس کے پاس تمام عالم کے لیے عشق کا پیغام ہے..... وما ارسلناک الا رحمتہ للعالمیں"

3- دولت کی (غلط) تقسیم' ارباب اقتدار کا قانونی امتیاز وغیرہ کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اس لیے اسلام میں سوشلزم یا اشتراکیت کا تصور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ ان خیالات کی روشنی میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاحیں بھی مضحکہ خیز بن جاتی ہیں۔ کیوں کہ اگر اسلام کا کوئی اقتصادی نظام ہے تو بس وہ اسلامی نظام ہے۔ اسے سوشلزم یا کیپٹل ازم کے سہارے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ نظام (سوشلزم اور کیپٹل ازم) اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور مذہب میں ان کی پیوند کاری سعی لاحاصل ہے۔

شمارہ نمبر 20- 21' بابت 12' 19 نومبر 1913ء میں مولانا آزاد نے دعوت انقلاب و اصلاح کا اولین نتیجہ تشکیل جماعت بتایا ہے اور لکھا ہے:

"دعوت الٰہی اگر کوئی بیج ہے تو اس کے درخت کی پہلی شاخ جماعت ہی ہے ... جب کبھی مصلحین حق کا ظہور ہوا'... ہمیشہ ان کا پہلا کام یہی رہا کہ انہوں نے اپنی تعلیم و دعوت کا

نمونہ ایک جماعت کی صورت پیش کیا... زبان کی پکار ضایع
جا سکتی ہے ...اعمال کی صدا کبھی جواب لیے بغیر نہیں رہتی
... اصلاح عالم کا... آخری ظہور (اس کا قدیمی نام اسلام) ...
بھی دنیا میں اس لیے آیا تاکہ ایک جماعت پیدا کرے اور
اس نے "جماعت" پیدا کی۔"

اس سے مولانا کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ افراد' چاہے وہ کتنے ہی صالح اور باشعور کیوں نہ ہوں' اپنی انفرادی حیثیت میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ اس کارنامے کی انجام دہی کے لیے آج کی اصطلاح میں "جماعت سازی" از بس ضروری ہے۔ گویا آج جس چیز کی ضرورت ہم سب محسوس کر رہے ہیں اس کا ادراک مولانا نے 1913ء میں کر لیا تھا اور اس کے لیے اسلام سے نہ صرف استدلال مہیا کر لیا تھا بلکہ اسے اسلام کی "دعوت انقلاب و اصلاح" کا اولین نتیجہ بتایا تھا۔

الہلال کے شمارہ نمبر 22' بابت 62 نومبر 1913ء میں مولانا نے "سر زمین محترم ہند کا فرزندان اسلام سے مطالبہ کے تحت قومیت اور بین الاقوامیت کے حدود تعلیمات اسلامی کی روشنی میں جس بصیرت ایمانی کے ساتھ واضح کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"انسانیت اور حق و عدل کے پرستاروں کے لیے امتیاز این و آن نہیں ہے۔ وہ جو وطن کی قید سے منزہ' زمین و مرزبوم کی تمیز سے پاک ہیں ان کے لیے خدائی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔ وہ انسانیت کے خادم ہیں' ان کی محبت نوعی کا شرف وطن و قوم کی ادنی ترین تقسیموں سے آلودہ نہیں ہوتا ... اسلام ایسی عالم پرستی کی دعوت لے کر آیا ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو

وطن پرست نہیں بلکہ انسانیت پرست دیکھنا چاہتا ہے لیکن اگر تمام عالم ہمارا وطن اور اس لیے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترام محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندان انسانیت ہمارے بھائی ہیں تو وہ انسان تو بدرجہ ء اولیٰ ہمارے احترام اخوت کے مستحق ہیں جو اسی خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بسنے والے پانی کو پینے والے اور اسی کی فضائے محبوب کو بیار کرنے والے ہیں۔"

دراصل یہ اس تحریر کا اقتباس ہے جو مولانا نے مسلمانان ہند کو جنوبی افریقہ کے ہندوستانی باشندوں کی حالت زار کی طرف متوجہ کرنے کی خاطر سپرد قلم کی تھی' اس میں گاندھی جی کا ذکر پہلی مرتبہ الہلال کے صفحات پر آیا ہے اور ان کے ایثار و قربانی کو سراہا گیا ہے۔ انھیں جنوبی افریقہ کی مجہول مقاومت کا "سپہ سالار" کہا گیا ہے اور ان کی قربانی کو "مقدس قربانی" کا نام دیا گیا ہے۔ "جاں فروش راہ حریت" ان کا ایک اور دوسرا لقب ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی تک گاندھی جی سے مولانا کی ملاقات اور ہندوستانی جہد آزادی میں ان کی رفاقت دور کی بات تھی۔ وہ کس حسرت سے لکھتے ہیں:

"یہ وہ مقدس ایثار ہے جس کے لیے ہندوستان میں ہم ترس رہے ہیں لیکن ہندوستان کا ایک فرزند ہندوستان سے باہر اس کا ناقابل فراموش نمونہ پیش کر رہا ہے۔"

اس کے بعد الہلال کے شمارہ نمبر 3 / دسمبر 1913ء میں گاندھی جی کی تصویر شائع ہوئی ہے اور اس کے نیچے انھیں "رئیس الاحرار مسٹر گاندھی" لکھا گیا ہے۔ اسی شمارے میں ہندوستان کے ایک اور مایہ ناز فرزند ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو ادب کا نوبل پرائز ملنے پر ان کی تصویر بھی شامل کی گئی ہے اور انھیں "شاعر

ہند" لکھا گیا ہے۔

دسمبر 1913ء کے آخر میں ملک کی تین اہم جماعتوں انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا محمڈن (حال مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کراچی اور آگرہ میں منعقد ہونے والے تھے۔ اول الذکر کا کراچی میں اور ثانی الذکر دونوں کے آگرہ میں۔ ان کے بارے میں مولانا آزاد نے الہلال کے شمارہ نمبر 24 بابت 10/ 1913ء میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> "مسلمانوں کا ایک سیاسی دور چند سال پیشتر تک تھا جو گزر چکا ہے... وہ زمانہ گیا جب انڈین نیشنل کانگریس کی شرکت کے تصور سے مسلمان کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں علی گڑھ کی برادری حقہ پانی بند نہ کر دے اور قومی اصطلاحات کی فرہنگ میں کسی مسلمان کے لیے سب سے بڑی گالی یہ تھی کہ اسے "کانگریسی" کہہ دیا جائے۔ اب تو وہ کلمہ "حق" جو حسین ابن منصور کی زبان سے نکلا تھا، خود علی گڑھ کے درودیوار سے اثبات وجود کرا رہا ہے۔ اب مسلمان کانگریس میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر ملک کی ایک سچی اور صادق العمل جماعت نے اپنی استقامت اور راست بازی سے ان کی ضد اور ہٹ پر فتح تو ضرور پالی ہے۔"

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بارے میں:

> "یہ مسلمانوں کا تمام ملک میں ایک ہی عظیم الشان مجمع ہوتا ہے اور ظلم ہے اگر اس کو مفید تر بنانے اور اس اجتماع سے حقیقی علمی و تعلیمی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے... اس سے حقیقی علمی و تعلیمی فوائد حاصل کرنے کی

کوشش کرنے کی کوشش نہ کی جائے... کانفرنس کو ایک اشد شدید نقصان تو یہ پہنچا کہ اس کا وجود بھی من جملہ ان موانع کے تھا جن کے ذریعے مسلمانوں کو سیاست کے درس و ذوق سے روکا جاتا تھا اور پالیٹکس باغ عدن کا شجر ممنونہ بن گیا تھا... عیب مے جملہ بگفتی، ہنرش نیز بگو۔ "ہنر" کا یہ حال ہے کہ علاوہ ان ضمنی فوائد کے جو کسی ایسے سالانہ اجتماع سے... حاصل ہوتے ہیں، ایک بڑا فائدہ خطبات علمیہ کا بھی تھا۔"

اس ضمن میں نواب محسن الملک، مولوی سید علی بلگرامی اور مولانا شبلی نعمانی کے لکچروں اور خواجہ حالی کی نظموں کی مثال دی ہے۔ پھر تحریر کیا ہے:

"سرسید کے بعد افسوس کہ روز بروز اس کے اجلاس بے مزہ ہوتے گئے۔ کہا گیا کہ تقریریں وغیرہ بالکل فضول ہیں، اب عملی کام ہونا چاہیے۔ اصل شے مسئلہ تعلیم ہے۔ عملی کام تو جو ہونا تھا ہو چکا، نتیجہ یہ نکلا کہ کانفرنس کے جلسے محض ریزولیوشنوں کی مصنوعی جنگ کا ایک تماشاگاہ بن گئے یا علی گڑھ کے لیے وسیلہ جمع مال۔"

آگے چل کر کانفرنس کے اس وقت کے جوائنٹ سیکرٹری صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے حسن مساعی کو خراج تحسین ادا کیا ہے اور ساتھ میں مشورہ دیا ہے کہ ریزولیوشن پاس کرنے اور کالج (مراد ایم۔ اے او کالج) کے لیے چندہ جمع کرنے کے ساتھ "عام قومی ضروریات اور مقامی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اور کچھ ایسا سامان بھی مہیا کیا جانا چاہیے جس سے قوم کی علمی معلومات اخلاق و تربیت اور مذاق تقریر و تحریر کو بھی نفع پہنچے۔"

مسلم لیگ کے بارے میں:

"اس سال مسلم لیگ کے جلسے میں غالبًا ایسے مسائل مہمہ پیش ہوں جن کے فیصلے کے بعد ہمیں یہ سمجھنے کا آخری موقع مل جائے گا کہ لیگ کوئی ضروری شے ہے یا نہیں۔ کل کی بات ہے کہ لیگ کی فرہنگ مصطلحات میں سیاست کے معنی غلامی لکھے تھے۔ اس اثنا میں... چند بندگان خدا نے چہرے سے نقاب الٹی اور چند مہینے کے جہاد لسان و قلم کے بعد ہی قوم.... بیدار ہوئی۔ اس کے بعد ایک جماعت پیدا ہوئی جس میں بعض لوگ تو وہ تھے جن کو ہدایت الٰہی نے روز اول ہی سے چن لیا تھا اور کچھ وہ تھے جو گو کہ ابتدا میں اس دعوت کے مخالفین و منکرین میں شامل رہے... لیکن بالاخر یا تو ناکامی نے سبق عبرت و موعظت دیا یا بعض اغراض و مقاصد نے مصلحت وقت کی سرگوشی کی۔ بہرحال انہوں نے روش بدلی اور آزادی و حریت کی راہ کا اعلان کیا... موجودہ حالت یہ ہے کہ لیگ نے چند قدم آگے بڑھائے ہیں اور ایک بہت بڑے بند فکر کو توڑنے کا اعلان کیا ہے۔ حالات کی تبدیلی نے قوت پیدا کر لی ہے اور جو خیالات کل تک چند "دشمنان علی گڑھ" کے تھے آج بہت سے پرستاران علی گڑھ کے ہوگئے ہیں... پس اب قوم کے سامنے اس کی سیاسی زندگی کا آخری سوال درپیش ہے... آخری وقت آگیا ہے کہ وہ اصول و صداقت کا ساتھ دے کر (اس امر کا کہ اشخاص پرستی کا بت کدہ ٹوٹ چکا ہے اور قوم اپنی زندگی کو خود اپنی زندگی سے ثابت کرنا چاہتی ہے) ثبوت دے۔"

ان تینوں جماعتوں سے متعلق مولانا کی مذکورہ بالا آراء ان کا سیاسی مسلک اور مسلمانان ہند کے لیے ان کی ترجیحات بخوبی واضح ہو جاتی ہیں۔

شمارہ نمبر13 بابت یکم اپریل 1914ء میں دہلی ڈپوٹیشن کے اڈریس کے جواب میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے یہ اختتامی جملے نقل کرتے ہیں:

"مجھے پوری امید ہے کہ خدا کی وحدانیت اور حکمراں کی وفاداری کی بابت آپ کے پاس اور خالص مذہب کا جو عقیدہ ہے وہ ہمیشہ ایک شعلے کی مانند روشن رہے گا۔"

اور اس پر اس طرح تنقید کرتے ہیں:

"ہم مسلمان ہیں اور تیرہ سو برس سے صرف اس لیے ہیں کہ خدا کی وحدانیت کا وعظ کہیں اور ہر طرح کی باطل پرستیوں کو' جو اس راہ میں مانع ہوں' اپنی خدا پرستانہ طاقت سے مٹا دیں... تاہم ایک غلط فہمی ہے جو اس کے ساتھ مل گئی ہے... انھوں (وائسرائے) نے عقیدۂ توحید کے ساتھ "حکم راں کی وفاداری" کا بھی اس طرح ذکر کیا ہے۔ گویا یہ بھی مثل عقیدۂ توحید کے اسلام کا کوئی اساسی اعتقاد ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں... اسلام کا اصل اصول صرف عقیدۂ توحید ہے۔ اس کے بعد اعتقاد رسالت و قرآن اور بعض ضروری اعمال و عبادات۔ "حکمراں کی وفاداری" اس میں داخل نہیں ہے... البتہ بعض جاہل اور خبیث روحیں کبھی کبھی کسی کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا کرتی ہیں کہ اسلام کا بنیادی اصول "وفاداری" ہے... بے شک وفاداری ہی وہ چٹان ہے جس پر اسلام کی عمارت قائم کی گئی ہے مگر خدائے واحد کی وفاداری' نہ کہ کسی اور کی۔

البتہ مسلمانوں کو امن پرستی اور حق کے تحفظ کے ساتھ اطاعت کیشی کا حکم مثل اور صدہا جزئی اور عام اخلاقی احکام کے دیا گیا ہے مگر نہ تو یہ کوئی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور نہ ہی عقیدۂ توحید کی حرمت اس کو گوارا کر سکتی ہے کہ خدا کی وفاداری کے ساتھ اس کے بندوں کا ذکر کیا جائے۔"

"حکم راں کی وفاداری" کا یہ انکار مولانا آزاد کے فلسفہ حیات میں غیر ملکی حکومت تک محدود نہیں تھا بلکہ قومی حکومت سے متعلق بھی ان کا یہی نقطہ نظر تھا جس کا ثبوت ان کی حصول آزادی کے بعد کی اس تقریر سے ملتا ہے جو انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں کی تھی اور جس کا یہ جملہ کہیں اوپر نقل ہو چکا ہے:

"میں تم سے نہیں کہتا کہ حکومت کے مدرسہ سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو۔"

مولانا آزاد نے الہلال کی جلد چہارم کے آخری شمارے بابت 24 / جون 1914ء میں الہلال کی دعوت کا جو نچوڑ پیش کیا ہے اس سے ان کے دینی و سیاسی مسلک کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ رقم طراز ہیں:

"پھر ایک خاص مقصد دینی اور دعوت اسلامی کا اعلان بھی اس کے پیش نظر تھا اور اپنے سیاسی معتقدات کی وجہ سے (جو اس کے عقیدے میں اس کے خالص دینی معتقدات تھے) طرح طرح کے موانع و مصائب سے بھی ہر آن اور ہر لمحے محصور رہنا پڑتا تھا جو بڑی بڑی بااقتدار طاقتوں کی طرف سے پیدا کی جاتی تھیں اور ہر طرح کی قوتیں اس کے ساتھ کام کر رہی تھیں... وہ احیائے تعلیمات صادقہ اسلامیہ کا داعی تھا' اسلام کی سنت حریت کی تجدید اور جہاد حق و

عدالت کی طرف بلاتا تھا۔"

گویا جہاد حریت مولانا کے نزدیک دعوت اسلامی کا جزو اعظم تھا اور یہی الہلال کا بنیادی مقصد تھا۔

الہلال کا یہ دور نومبر 1914ء تک جاری رہا۔ باقی پانچ ماہ کے شماروں میں بھی یہی موضوعات اسی انداز سے زیر بحث آتے رہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اقتباس سے مولانا کا موقف بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی اچھی طرح ذہن نشیں ہو جاتا ہے کہ ان کا بنیادی موقف ہمیشہ ایک ہی رہا۔ البتہ زندگی کے تجربات اور حالات کی تبدیلی نے ان کی نظر میں زیادہ وسعت اور ان کی فکر میں زیادہ گہرائی پیدا کر دی تھی۔

حواشی

1- مولانا غلام رسول مہر: مولانا آزاد ایک نادر روزگار شخصیت، مطبوعہ لاہور، 1994ء، ص 251-

2- پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی: میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد (مکتوب مولانا مہر بنام شروانی) مطبوعہ کراچی، 1988ء- ص 122-

3- پروفیسر رشید الدین خان: مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت، سیاست، پیغام۔ مطبوعہ نئی دہلی، 1989ء، ص 101-

4- Speeches of Maulana Azad : New Delhi 1989- p. 150- Published by Publication Division, Govt of India

5- Maulana Abul Kalam Azad : India Wins Freedom. New Delhi, 1988. p. 32